پانچواں سفر ۔ لکھنؤ

رَتھوں، سائیکلوں اور بیل گاڑیوں کے سفر بہت جلدی ختم ہو گئے ۔ اِدھر عمر آٹھ سال کے لگ بھگ ہوئی، پردہ کی ذمہّ داریاں بہت بڑھ گئیں ۔ سفر زیادہ تر ڈولیوں اور پالکیوں میں ہونے لگا ۔ اگر تانگہ میں بھی گئے تو تانگہ کے چاروں طرف چادروں سے پردہ رہتا تھا ۔ تقریباً ۱۹۴۴ء تک اسی طرح سلسلہ چلا، اور ہم تقریباً ۱۵/سال سے ذرا ہی کم تھے کہ ۱۴/مئی ۱۹۴۴ء بمطابق ۲۱/جمادی الاوّل ۱۳۶۳ھ کو ہماری شادی کیپٹن ذاکر حسین نقوی سے ہوگئی ۔ شادی کے بعد ہمارے شوہر کا، اور ان کے گھر کا مزاج اور معاشرہ ہمارے والد کے گھر سے بہت مختلف ملا ۔ گو کہ ہمارے سسر ڈاکٹر امتیاز حسن وضعدار آدمی تھے، لیکن ان کی برطانوی تعلیم نے ان کے گھرانے کو کافی مختلف کر دیا تھا ۔ پھر شادی کے بعد ویسے بھی آزادی زیادہ ہوتی ہے ۔ غرض یہ کہ اب ہم نسبتاً زیادہ آزادی سے گھوم پھر سکتے تھے ۔

شادی ہوئے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ جولائی ۱۹۴۴ء میں ہمارے شوہر کو جنگ عظیم میں شرکت کے لئے مشرقِ وسطیٰ میں جانا پڑ گیا، اور ہم نے ابھی اپنے سوا دو مہینے کی رسم بھی نہیں منائی تھی ۔ اب بس ہم رہ گئے اور ہمارے سسرال والے ۔ کبھی میکہ میں وقت گزارتے، لیکن مشکل ہی سے ۔ انہی ہنگامی حالات میں لکھنؤ سے شادی کا ایک بلاوہ آیا ۔ پرانی ملاقات رشتے داریوں کی طرح مضبوط ہوتی تھیں ۔ یہ بلاوہ جن خاتون کے گھر سے آیا تھا وہ ہماری ساس کی ''دوپٹہ بدل بہن'' تھیں ۔ اب یہ کیا رشتہ تھا، اس کی تفصیل صحیح بیان کرنا لفظوں میں ممکن نہیں ہے ۔ ان خاتون کے ایک صاحبزادے شہنشاہ نواب تھے جو بعد میں لاہور میں پاکستان ٹیلی ویژن

کے بانیوں میں سے تھے اور وہاں ایک پروڈیوسر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ان خاتون کے سارے اقرباء گولا گنج لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔اب ان لوگوں سے ہمارے خاندان کی ۸۰/ یا ۹۰/ سال کی دوستی ہے۔بہرحال ایک ہفتہ کے لئے ان کے ہاں جانے کا ارادہ کیا۔

اب وہاں پہنچے تو شادی کا سلسلہ تھا، سب مصروف تھے۔اِس شادی میں اُس وقت کی شادیوں کی طرح جب ماتھے پر ٹیکہ اور ناک میں نتھ کے ساتھ دلہن فرشی پائنچہ سنبھال کر اس پائنچے کو اپنے ہاتھ پر رکھے ہوئے آئی تو ہمیں یہ حور لگی۔لیکن ہمیں اس دور کے لکھنؤ کے غرارے اور ۱۲/ سے ۱۶/ گز کپڑے میں تیار ہونے والے فرشی پائنچہ اپنے لئے کوئی خاص پسند نہ تھے۔باریک کرتا، چنا ہوا بڑا سا دوپٹہ، گوٹے ٹکے آنچل پر بادلہ ٹکا ہوا، اوپر شلوکے پر جال کا کام بنا ہوا، اور بھاری سی اوڑھنی، یہ تھا ہمارا لباس۔شادی کا دن بھی گزر گیا اور دلہن روتی دھوتی، اور دِل میں چوری چُھپے خوش خوش اپنے گھر سے روانہ ہوئی تو گھر میں افراتفری کچھ کم ہوئی اور ہم نے اپنے بارے میں کچھ سوچا کہ یہاں لکھنؤ شہر دیکھنا ضروری تھا۔

لکھنؤ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کیونکہ اودھ کی ریاست کا گڑھ تھا۔دیکھنے کی بہت جستجو تھی۔ہمارے گھر سے صرف عورتیں ہی چلی تھیں اس شادی پر، لہذا جب وقت ملتا بھی تو ہم کو مجبوراً گھر میں سب کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔لکھنؤ میں بازار میں عورتیں اکیلی ہی نکلنے لگی تھیں۔اسکول، کالج اور شادی بیاہ کے موقع پر بھی اکیلی ہی جاتیں۔اور تو اور، برقع پہن کر اکیلی ہی بائیسکوپ دیکھنے، یعنی کہ سنیما نکل جاتی تھیں۔اس سے ہمیں بھی ہمت ہوئی اور ہم بھی برقعہ سنبھال کے اپنے گھر ہی کی خواتین کے ساتھ لکھنؤ دیکھنے نکل گئے۔سب خواتین وحضرات تانگے میں جارہے تھے۔سو ہم نے بھی تانگہ کیا۔

لکھنؤ ۔ بڑا امام باڑہ (آصفی امام باڑہ ۔ نواب آصف الدولہ ۱۷۸۴ء)

ایک ہی دن میں ہم نے بڑا امام باڑہ اور چھوٹا امام باڑہ دیکھا۔ رومی دروازہ دیکھا اور حضرت گنج کی طرف گئے۔ کلّہم ایک دن ملا تھا، چاہتے تھے کہ سب کچھ دیکھ لیں اور ساڑھیوں کی خریداری بھی کر لیں کہ لکھنؤ کی ساڑھیاں بہت مشہور تھیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کی چکن کی کڑھی ٹوپیاں، انگھر کے اور دوپٹہ بھی اعلیٰ پیمانے کے ہوتے تھے، اور عطر بھی۔ ان میں سے خس کا عطر ہمارا پسندیدہ تھا جو ایک خاص گھاس کی جڑوں سے بنتا ہے اور ہم یہی عطر آج تک استعمال کرتے ہیں۔ راستے میں دوسری عمارتیں بھی دیکھیں کہ سب قریب قریب ہی تھیں۔

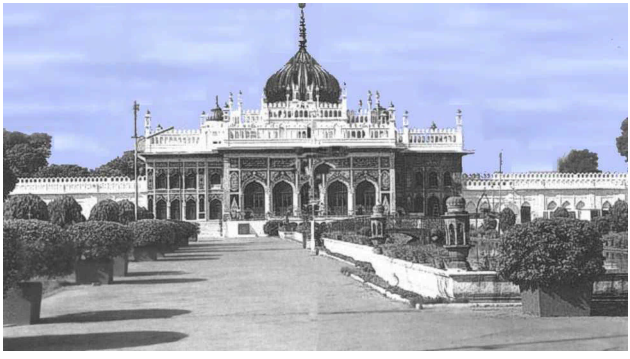

لکھنؤ ۔ چھوٹا امام باڑہ (حسین آباد امام باڑہ ۔ نواب آصف الدولہ ۱۷۸۴ء)

لکھنؤ ۔ رومی دروازہ

اب ہم نے لکھنؤ کے حضرت گنج اور چوک میں وقت گزارا اور ۴۰ روپے میں ایک ساڑھی خریدی، بنارسی، خالص زری، چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی۔ گھر لائے، دوسری خواتین کو دکھائی تو ہر ایک یہی کہے کہ ''اے بہن آپ بہت مہنگی لائیں، ارے ہم کو ساتھ لے لیتے تو ہم آپ کو ۳۰ روپے میں دلوا دیتے''۔ لیجیئے، سارا مزا کرِکرِا ہو گیا! ہم نے اس ساڑھی کو اٹھایا اور دھب سے بکسے میں ڈال دیا۔ اُس وقت چمڑے اور پلاسٹک کے بکسے تو تھے نہیں جنیں اب ''سوٹ کیس'' کہتے ہیں۔ سفر کا سامان بکسے میں ہی چلتا تھا جسے کچھ لوگ سوٹ کیس کہنے لگے تھے۔ لیکن بکسے کے دِل سے پوچھیں تو وہ غالباً خود کو بکسا کہلانا ہی چاہتا ہوگا۔

دوسرے دن ہم لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور سب سے مل کر رونا دھونا ہوا کہ رامپور واپس جانا تھا۔ یہ خیال نہیں کہ لکھنؤ چھوڑنے کا افسوس بھی اس میں شامل تھا۔ رامپور تو قریب ہی تھا، لیکن اس کے بعد جو ہم ان لوگوں سے بچھڑے تو کوئی ۱۷/۱۸ سال کے بعد لاہور میں ملے جب شہنشاہ نواب لاہور ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر کے عہدے پر فائز تھے۔

اب گھر آئے اور اماں کو یہ ساڑھی دکھائی تو امّاں نے دوسری طرح کی نصیحات کیں کہ ''بیٹا! ابھی تو شادی ہی کی ساڑھیاں نئی نئی پڑی ہیں، پیسہ دیکھ کہ خرچ کرنا چاہیئے''۔ ویسے بھی جنگ ہو رہی تھی اور ہمارے شوہر جنگ پر تھے۔ بس پھر ہم نے وہ ساڑھی اپنی باجی کو دے دی، یہ کہہ کے کہ ''باجی یہ آپ پر اچھی لگے گی''۔ ہماری زندگی کی پہلی بڑی خریداری تھی جو ہم نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ ہم نے کبھی کسی کی خریدی ہوئی چیز پر ایسا تبصرہ نہیں کیا کہ ہمارے تبصرہ سے خریدار کا دل دُکھے۔

چھٹا سفر ۔ میرٹھ اور دہلی

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد شروع میں ہمارے شوہر کی دہلی میں خیبر لائنز میں رہائش رہی۔ وہاں پر ہم بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ ذاکر صاحب تو دہلی میں اپنی تعلیم کے لئے پہلے بھی رہ چکے تھے، لیکن ہمارے لئے یہ شہر ایک نئی اور نرالی دنیا تھی، اور یہ رامپور کے چھوٹے ریاستی شہر کے مقابلے میں ایک نہایت گہما گہمی سے بھری جگہ لگی۔

میرٹھ کا سفر

کچھ ہی دنوں بعد ذاکر صاحب کو نقشوں کے کورس کے لئے میرٹھ بھیجا گیا اور ہم بھی ساتھ گئے۔ انگریزی دور میں میرٹھ ایک اہم فوجی چھاؤنی تھی، اور یہ چھاؤنی بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دہلی کے شمال مشرق میں دہلی سے تقریباً ۶۷ کلومیٹر یعنی ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ریل گاڑی نے ہمیں تقریباً دو گھنٹے میں میرٹھ کے اسٹیشن پر اتار دیا۔ میرٹھ میں ہم نے ایک ہوٹل میں قیام کیا، اور یہ ہماری زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ناشتہ تو ہم اپنے کمرے میں کرتے تھے کیونکہ ذاکر صاحب صبح ہی صبح اپنی کلاس میں چلے جاتے تھے، لیکن دوپہر اور رات کا کھانا ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کرتے تھے۔

انگریزوں کا زمانہ تھا اور ہوٹل میں انگریز فوجی بھی ہوتے تھے۔ ڈائننگ ہال ٹپ ٹاپ سجا ہوتا تھا۔ دوپہر کو کھانا بھی انگریزی ہوتا تھا، اور انگریزی طور طریقے استعمال ہوتے تھے۔ ہم نے گھروں میں تو غلطی

سے بھی چھری کانٹے سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہم سب زمین یا تخت پر دسترخوان پر کھانا کھانے کے عادی تھے، اور ہمیں ہمیشہ سے تاکید تھی کہ کھانے کا نوالہ سیدھے ہاتھ سے منہ میں لے کر جانا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہاں چھری کانٹے کے بغیر ہم صرف پانی پی سکتے تھے کیونکہ پتلی پانی جیسی یخنی بھی چمچے سے پینا پڑتی تھی۔ پھر اس پر جبر یہ کہ کانٹا الٹے ہاتھ میں ہو، اور روٹی سیدھے ہاتھ پر نہیں، الٹے ہاتھ پر ہو۔ ہر نوالے پر اماں اور ابا کی ساری نصیحتیں آڑے آئیں۔ ہمارے شوہر نے بڑا ساتھ دیا اور ہمیں ایک دو استعمال کے بعد ہی اس طرح کھانے میں بالکل ہی دشواری نہ ہوئی۔ لیکن دوسری مشکل جو ہمیں ہوئی وہ تھی کھانے کی خوشبو اور مزہ۔ کھانے میں اُبلے ہوئے چاول، مچھلی، یخنی یعنی سُوپ، اور نمکین بسکٹ کے ٹکڑے۔ جنگ کے بعد راشن تو ہر جگہ تھا لیکن کم از کم رامپور میں اسکے نفاذ پر عمل نہیں تھا اور ہم اپنے مزے کا کھانا پکاتے رہے تھے۔ یہاں کھانے بدمزہ تھے، انتہائی بدمزہ۔ یہ اُبلے ہوئے آلو اور ابلی ہوئی گوبھی والا کھانا ہم سے نہ کھایا جاتا تھا۔ سو خدا بھلا کرے ہمارے اردلی کا کہ ہمارا آدھا پیٹ کھانا دیکھ کر اس کا دل دُکھا۔ انگریزی کھانا صرف آفیسران اور ان کی بیگمات کی سزا تھی اور دوسرے فوجی اور ان کے ملازمین پر انگریزوں کا رحم تھا کہ وہ پر ذائقہ ہندوستانی کھانا کھا سکتے تھے۔ ایک دو دن اس تکلیف کو دیکھ کر ہمارے اردلی کو احساس ہوا اور اس نے ہمیں اپنا کھانا ہمارے کمرے میں لا کر دینا شروع کر دیا تو ہماری جان میں جان آئی۔

رات کا کھانا بھی ڈائننگ ہال میں ہوتا تھا، لیکن یہ دیسی ہوتا تھا۔ اس میں ہم سب لوگوں سے ملتے تھے، اور انہی میں سے ایک لفٹننٹ شاہ عالم کی بیگم تھیں۔ یہ لفٹننٹ صاحب رامپور میں ہمارے شوہر کے ساتھ انہی کی انفنٹری میں تھے، اور میرٹھ میں لمبے عرصے کے لئے تعنیات تھے۔ ان کا گھر ''بیگم کا پل'' نامی محلّے میں تھا۔ محلّہ بیگم پل اب میرٹھ کے شہر کا بیچ ہے، اور یہاں بہت تجارتی دفاتر، دکانیں، اور بینکوں کے دفتر ہیں۔ اُس وقت یہ رہائشی علاقہ زیادہ تھا اور تجارتی کم۔ اس خاندان سے ہماری پرانی واقفیت تھی۔ یہ اکیلی جگہ، پھر ذاکر صاحب بھی سارا دن اپنی تربیت پر رہتے تھے، اور ہم اس طرح اکیلے رہنے کے بالکل عادی نہ تھے۔ لہذا بیگم شاہ عالم کے گھر آتے جاتے رہے، اور ان کی تین بہنوں، قمر، مہر، اور بدر سے بھی ملاقات رہی۔ پندرہ دن تیزی سے گزر گئے اور واپس دہلی جانے کا وقت آ گیا۔

میرٹھ چھوڑتے وقت ہم سوچ رہے تھے کہ اس جگہ ہم پہلی بار ایک ہوٹل میں ٹھہرے، اور کئی دن

ایک اکیلے کمرے میں گزارے۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ انگریزی کھانا کھایا، چھری اور کانٹے سے۔

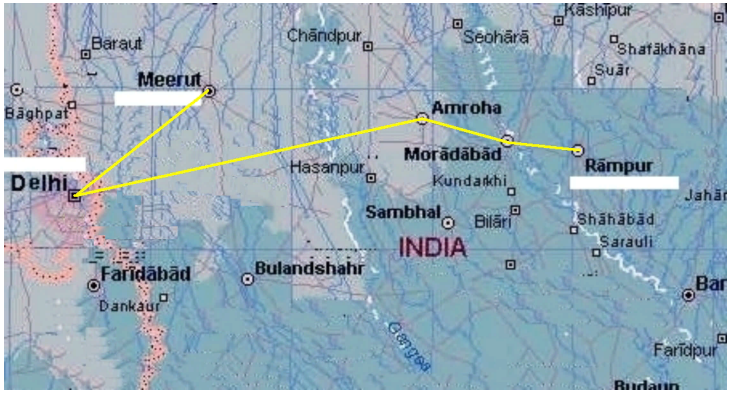

رامپور سے دہلی اور میرٹھ

"اب دِلّی دور نہیں"

دہلی واپس پہنچنے پر ہم خیبر لائنز کے فوجی بیریکس میں ٹھہرائے گئے تھے۔ دہلی کے جنوبی حصہ میں یہ علاقہ شہر سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ بیریکس دو کمروں کے ٹاؤن ہاؤز کی طرح کی تھیں۔ ہر آفیسر کے پاس صرف دو کمروں کے گھر تھے، اور تمام فوجی جنگ سے واپس آکر یہاں روکے جا رہے تھے۔ پانی، بجلی اور دوسری ضروریاتِ زندگی پر راشن تھا۔ یہ گھر لکڑی کے بنے تھے، بہت اونچی چھتوں والے گھر، کافی پرانے بنے ہوئے یہ گھر بالکل کھلے علاقے میں تھے۔ جب رات کو ہوا چلتی تھی تو سناٹے میں ہوا کی زوردار آوازیں آتی تھیں۔ باہر محافظ (گارڈز) پہریدار ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود ایک روز ایک آواز نے ہمیں ڈرا دیا۔ ہم سو رہے تھے کہ ہمیں ایسا لگا کہ کھڑکی میں کوئی چپڑ چپڑ کر کے منہ میں کچھ چبا رہا ہو۔ ذاکر صاحب کو جگایا اور انہوں جا کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ ایک بیل صاحب کھڑکی سے سر اندر کر کے منہ ڈالے ہوئے جگالی فرما رہے تھے۔ شکر یہ ہوا کہ اس وقت ذاکر صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے ورنہ اس بیل کی جگہ ہم اس کو بھوت سمجھ کر خاموشی سے لیٹے رہتے۔ بس ایسے ہی ہُو کے عالم والی جگہ تھی۔

ذاکر صاحب بہت پابندِ اصول تھے۔ کچھ تو طبیعتاً اور کچھ فوج کی تربیت۔ انگریز کی حکومت میں اس یونٹ میں بمشکل چند ہی انگریز تھے جو صرف اوپر کے عہدے سنبھالے بیٹھے تھے۔ باقی سارے علاقائی لوگ

تھے۔ ذاکر صاحب کا یونٹ رامپور کی فوج کا تھا اور ریاستی معاہدوں کی وجہ سے اس کے لئے زیادہ سہولتیں تھیں بنسبت ان افسران کے جو براہِ راست انگریزی فوج کے ماتحت تھے، گو کہ دونوں طرح کے فوجی برٹش انڈین آرمی کے لئے ہی تھے۔ دوسرے افسران کی بیگمات جو ساتھ ہی کی اقامت گاہوں میں رہتی تھیں اچھی ملنسار ثابت ہوئیں اور ہم آسانی سے ان کے گھر آجا سکتے تھے۔ یہاں ڈولیوں اور پالکیوں کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی مانگنے پر مل سکتی تھیں۔ جنگ نئی نئی ختم ہوئی تھی اور ذاکر صاحب کے یونٹ میں کام بہت تھا، اور یہ دوسرے افسران کی طرح سارا دن کام میں مصروف رہتے تھے۔ سارا دن تمام بیگمات گھر پر رہتی تھیں اور سب ہی بالکل نئی بیگمات تھیں، یعنی کہ ہم سب اکیلے تھے، بغیر بچوں کے۔ ہم سب گھر سے نکل کر گھومنا چاہتے تھے۔ اسی لئے ایک دن ان خواتین میں مسز مرتضٰی، مسز شبیر، مسز شریف، اور مسز ضمیر، سارے کے سارے تہیہ کر بیٹھے کہ اس دن قطب مینار دیکھنے ضرور جائیں گے۔ دہلی میں نسبتاً آزادی تو تھی، لیکن پھر بھی ہم نے مرد کے ساتھ جانا ضروری سمجھا۔ مسز مرتضٰی کے دیور کی شامت آگئی اور ان کے ذمّہ سارا کام ڈال دیا گیا۔ اِس کام کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ وہ کرائے کے تانگے پکڑ کر لائے۔ ہمارے ساتھ میں ایک اردلی صاحب بھی تھے، اور اردلی کے ساتھ کھانا، گراموفون اور ریکارڈ۔ گراموفون بجلی یا بیٹری کے نہیں تھے بلکہ ان میں پہلے چابی بھرنا پڑتی تھی جس سے کہ ایک اسپرنگ بندھ جاتا تھا۔ جب یہ اسپرنگ واپس کُھلتا تھا تو ریکارڈ گھومنے لگتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد جب اسپرنگ ڈھیلا پڑتا تھا تو گانے والے کی آواز رونے میں تبدیل ہو جاتی تھی، اور پھر اردلی کو آواز پڑتی تھی کہ وہ پھر چابی بھرے۔ ویسے تو اس مرتبہ مسز مرتضٰی کے دیور ساتھ تھے، لہذا اردلی کا کام صرف کھانا گرم کرنا اور کھلانا تھا۔

شہر میں سب سے پہلے ہمایوں کے مقبرے پر گئے۔ پھر خواجہ ناظم الدّین اولیاء کے مزار پر گئے، اور یہاں فاتحہ پڑھتے وقت خیال آیا کہ ہمایوں کے مقبرے پر کسی نے بھی فاتحہ نہیں پڑھی تھی۔ پھر دہلی کی باؤلیاں دیکھیں۔ دہلی گیٹ کے علاقے میں اتنی اونچائی اور پھر اتنی ہی ڈھلان تھی کہ اوپر نیچے ہوتے ہوئے ہمیں اپنے بابا کے گھر والے جھولے کے پینگ یاد آنے لگے۔ تانگے میں بیٹھے تو ہم اپنے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے چلتے رہے۔ تانگے میں اردلی نے گراموفون میں چابی بھری رکھی تھی۔ اس وقت فلم ''من کی جیت'' شروع ہوئی تھی اور اُس کے گانوں کی دُھوم مچی تھی۔ سو وہ گانے ہمارے ساتھ تھے۔ اب آج کے دور میں جب ہمارے بچے اپنی کاروں میں کیسٹ پر گانے سنتے تھے، اور آجکل جب اِن کی اولادیں کار میں کمپیکٹ ڈسک سے گانے

سن کر اِسے ''فن'' (Fun) کہہ رہے ہوتے ہیں تو ہم اُنہیں یہ گانے سننے سے منع کرتے ہیں کہ ڈرائیور کی توجہ ہٹتی ہے۔ انہیں کیا اندازہ کہ اس فن کی ابتداء کس طرح اور کس نے کی تھی۔

ذاکر صاحب کو پکّے گانے پسند تھے۔ استادوں میں سے تھے استاد فیاض خاں، کریم خاں، مشہورِ زمانہ رامپوری طبلہ نواز احمد جان تھرکوا، سارنگی نواز امراؤ خان وچتر وینا، جلترنگ نواز عنایت حسین خان، اختری بائی فیض آبادی، اور ملکہ پکھراج۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ان کے پروگرام نشر ہوتے تھے، لیکن ہمیں یہ کم ہی سمجھ میں آتے تھے کیونکہ اس وقت سے پہلے اپنے والدین کے رامپور والے گھر میں ہمارا اِن چیزوں سے زیادہ رابطہ نہیں رہا تھا۔ ان میں سے کریم خاں کی آواز ہمیں بہت پسند تھی، اور ان کا ایک گانا ہمیں بہت پسند تھا، ''جمنا کے تیر''، جو غالباً بھیرویں راگ میں تھا۔ لیکن اِن تانگوں پر بھیرویں اور راگوں کا کوئی موقعہ نہیں تھا اور ہم تو بس فلمی گانے سنتے ہوئے آس پاس کی عمارتیں اور سڑکیں دیکھتے رہے۔ اسی طرح شام ہو چلی اور ابھی قطب مینار دیکھنا باقی تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے پیر پھول کر ڈبل روٹی کی طرح ہو چلے تھے، سارا دن تانگوں میں بیٹھے بیٹھے۔ جوتے بھی ہم ہیل والے پہنے تھے، باریک پینسل ہیل والے۔ لوگ جوتے بمبئی یا کلکتہ سے منگواتے تھے، باٹا کے۔ دہلی میں بھی جوتے بنتے تھے، لیکن فیشن بمبئی میں تھا، اور فیشن ہمیشہ اہم رہا ہے، برقع کے اندر بھی، اور برقع کے بغیر بھی۔ اب اس حالت میں قطب مینار پر چڑھنا محال ہو گیا۔ مرتے کھپتے اوپر گئے تو نیچے اترنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بہرحال نیچے اترے، اور گھر پہنچ کر تھکان سے فوراً ہی سو گئے۔ قطب مینار اس وقت ہماری زندگی کی سب سے اونچی عمارت تھی جو ہم نے سَر کی تھی، اور اتنی سیر ہم نے ایک دن میں اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔

میرٹھ سے دہلی واپسی کے دوسرے ہفتے میرٹھ سے بدر، قمر، اور مہر دہلی پہنچ گئیں۔ ان سے ہماری میرٹھ میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ اپنے تانگہ میں آئیں تھیں، جیسے کہ آجکل کے زمانے میں لوگ اپنی کار چلا کر ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچ جاتے ہیں۔ میرٹھ سے دہلی کا یہ سفر کم از کم ۴ر سے ۵ر گھنٹے کا رہا ہوگا۔ ان کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔ آجکل ہم اپنے محلّہ میں بھی جاتے ہیں تو پہلے ٹیلیفون پر وقت طے کر کے پھر کسی کے یہاں جاتے ہیں، اور یہ اتنی دُور سے تانگے میں آئی تھیں۔ لیکن ہمیں کوئی زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ایسا ہی رواج تھا۔ ان کا تانگہ ٹم ٹم نما تھا۔ پروگرام بن گیا کہ اسی دن رات کو فلم ''من کی جیت'' دیکھی جائے۔

سنا تھا کہ اس فلم میں گانے جوش ملیح آبادی نے لکھے تھے۔ یہ بازگشت ہماری پارٹی کو پہنچ گئی، اور اب پورا قافلہ ساتھ جانے کے لئے مصر تھا اور سواری کے لئے بس ایک وہی تانگہ میّسر تھا۔ ''نہ جائے رفتن نہ پائے رفتن''۔ طے یہ ہوا کہ سارے لوگ اسی تانگے پر بیٹھ کر چلیں اور اگر آگے کوئی اور تانگہ مل گیا تو صحیح ورنہ اسی گھوڑے کی شامت جو پہلے ہی سارا دن چل کر یہاں پہنچا تھا۔ خیر تانگے مل گئے، لیکن ڈر یہ تھا کہ واپسی کیسے ہوگی کیونکہ خیبر لائنز کے شہر سے دور ہونے کی وجہ سے تانگے یہاں کم ہی آتے تھے۔ سنیما پہنچے تو بائیسکوپ کے دوسرے شو کا وقت تھا۔ اس زمانے میں فلم کو بائیسکوپ ہی کہتے تھے۔ ٹکٹ لئے اور فلم دیکھنا شروع کی۔ اِدھر ہم فکرمند رہے کہ واپسی کیسے ہوگی۔ فلم دیر سے ختم ہوئی، رات ہو چلی تھی۔ واپسی کے لئے دو تانگے طے کئے، تنگنے کرائے پر۔ رات گھر پہنچے تو ڈھائی بجنے والے تھے۔ دوسرے دن میرٹھ کی خواتین واپس چلی گئیں۔ یہ دن اور یہ فلم ہمارے ذہن میں اُس جذبہ کی وجہ سے رہ گئی جس سے یہ تینوں بہنیں ہم سے ملنے تانگہ پر میرٹھ سے دہلی آئی تھیں۔

نئی دہلی میں اب اونچی عمارتیں بننے لگی تھیں۔ اسی میں سے ایک عمارت ''ڈے وی کو'' کی تکمیل کے لئے ایک چھوٹا سا جشن منایا گیا اور اس میں کئی فوجی افسران کو بھی دعوت دی گئی۔ ہم بھی گئے۔ کسی کے پاس کار تو ہوتی نہیں تھی۔ ذاکر صاحب کے پاس رامپور میں تو موٹر سائیکل تھی، اور یہاں پر سرکاری جیپ۔ لیکن اسے ذاتی کام کے لئے لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا ذاکر صاحب کے ایک دوست کی کار میں ہم سب اس دعوت میں گئے۔ بڑے محضوظ ہوئے۔ یہ ہماری زندگی کی پہلی محفل تھی جو شہری ثقافت کی غمّاز تھی۔

دہلی میں مہنگائی کافی ہو چکی تھی اور ہم بھی جنگ کے بعد کے حالات دیکھتے ہوئے کافی کفایت شعاری سے کام لینے لگے تھے۔ اگرچہ ہمارے شوہر صاحب تقریباً ساڑھے سات سو کی تنخواہ لے رہے تھے، ان کے ساتھ کے وہ حضرات جو انگریزی فوج سے براہِ راست تنخواہ لے رہے تھے وہ اِن سے کافی کم پیسے لیتے تھے اور پھر بھی بہت خوش تھے۔ سو ہم نے کثیر مقدار میں اشیاء کی خریداری کی، جن میں اکثر اس زمانے کے فیشن کی چیزیں تھیں۔ کچھ ایسی ساڑھیاں کہ جن کے اندر آدھا کلو کے قریب چاندی کے تار کڑھے ہوئے۔ انہیں باندھو تو سنبھالنا مشکل، اور قیمت بھی ڈھائی سو کے لگ بھگ۔ ذاکر صاحب پہلے ہی ہم کو اس طرح کی ایک ساڑھی لا کر دے چکے تھے لہٰذا ہم نے اس کی خریداری نہ کی، لیکن دوسری ریشم کی ساڑھیاں خریدیں جو سالوں چلیں۔

ہمارے شوہر دہلی کے اینگلو عربک کالج کے پڑھے ہوئے تھے اور وہاں کرکٹ کی ٹیم کے کپتان رہ

چکے تھے۔ اسی لئے ان کے دہلی میں بہت دوست احباب تھے۔ انہی میں سے ایک شاہد احمد دہلوی تھے، دوسرے دریا گنج میں جاوید صاحب تھے جنہوں نے بعد میں مرقعِ چغتائی کو ہاتھی دانت میں تراش کر بہت نام کمایا تھا۔ ہمارا ڈان (Dawn) اخبار کے دفتر بھی جانا ہوا اور وہاں اخبار کے مدیر اعلیٰ سے ملاقات ہوئی۔ ہمدرد دواخانہ میں ذاکر صاحب کے کچھ دوست تھے جن کے گھر ہم ہفتہ کی شام کو جاتے اور اتوار کی شام کو واپس آتے تھے۔ غرض اسی طرح ہر شام ہم کہیں نہ کہیں ضرور جاتے تھے اور ہفتے گزرتے رہتے تھے۔ رامپور کا پردہ ختم ہو گیا تھا اور ہم حیران ہوتے تھے کہ اس کے ختم ہونے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی۔ جب پاکستان بنا تو یہ تمام لوگ، اور میرٹھ کی تینوں بہنیں، سب ہی پاکستان ہجرت کر کے آ گئے تھے، اور کبھی کبھی ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، کوئی محکمہ ٹیلیفون میں تو کوئی پاکستان کسٹمز میں، اور کچھ لوگوں کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں آ کر رہے تھے۔

دہلی ۱۹۳۸ء :ذاکر صاحب کرکٹ کے میدان میں

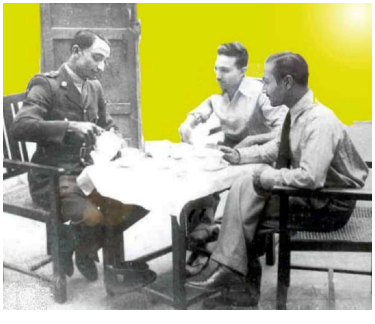

دہلی ۱۹۴۶ء : ذاکر صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ۔ جنگ کے بعد فوج کے حالات اچھے نہ تھے، اور اِس کے بارے میں گفتگو کے لیئے چائے ضروری تھی۔

اُدھر دہلی میں ہمارا وقت گزرتا رہا، کچھ نئی واقفیتیں ہوئیں، تھوڑی ہی دیر چلیں۔ لوگوں کے تبادلے جلدی جلدی ہوتے رہتے تھے۔ ابھی ۱۹۴۵ء ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ذاکر صاحب کے دہلی سے کوہاٹ تبادلے کے فیصلہ کے بارے معلوم ہوا اور اِس کے کاغذات بھی جلد ہی آ گئے۔ ہم نے اپنے ان دوستوں کو خدا حافظ کہا جو کچھ نئے تھے اور کچھ پرانے۔ کچھ سے ہم بعد میں ملے، اور کچھ کا نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے۔

ساتواں سفر ۔ دہلی سے کوہاٹ

دہلی سے لاہور کے سفر کے لئے پورے یونٹ کے لئے ایک مخصوص ٹرین کا انتظام کیا گیا تھا۔ گرمی ابھی تک تھی گو کہ سال ختم ہونے کو تھا۔ ویسے سفر آرامدہ تھا۔ ٹرین میں افسران کے ہر ڈبّے میں برف کی سلیں رکھ دی جاتی تھیں اور اوپر بجلی کے پنکھے با آواز بلند تیزی سے گھوم رہے ہوتے تھے۔ اس انتظام سے گرمی کا احساس کم ہوتا تھا۔ ہیضہ (کالرا) پھیلا ہوا تھا اور تمام فوجیوں پر پابندی لگی ہوئی تھی کہ وہ اسٹیشن سے کوئی بھی چیز نہ خریدیں۔ لاہور پہنچ کر ٹرین چار دن تک اسٹیشن پر کھڑی رہی اور پوری فوج ٹرین ہی میں ٹھہری رہی۔ ہم لوگ کھانا کھانے کے لئے کبھی باہر نکلتے تھے تو اچھے ہوٹلوں اور ریستوراں میں بھی اچھا کھانا نہیں ملتا تھا۔

لاہور سے یہ قافلہ اسی ٹرین میں کوہاٹ روانہ ہوا۔ کہیں خطرہ ہوتا تو پوری ٹرین رات بھر کے لئے جنگل بیابان میں روک دیتے تھے اور پھر صبح کو چلتے۔ بھاپ کے انجن کی ٹرین تھی۔ کہیں رُک رُک کر پانی اور کوئلہ لینا پڑتا۔ سنتے تھے کہ یہاں کے لوگ پوری پوری ٹرین لے جاتے تھے اور ریل کے انجن کی دھات پگھلا کر اس کو اسلحہ بنانے میں استعمال کرتے تھے۔ نہ جانے کتنا سچ تھا اور کتنا انگریزوں کا اُڑایا ہوا جھوٹ۔ پہاڑی راستہ تھا اور راستے میں کتنے ہی دریا اور بڑی بڑی نہریں آتی رہیں۔ اسی طرح رُکتے رُکاتے، لاہور سے کوہاٹ کا بمشکل تین سو میل کا فاصلہ پانچ دن میں طے کیا۔ رات ہونے والی تھی اور یہاں بھی بیریکس میں گھر ملا۔ میس سے کھانا آیا جسے کھا کر ایسا سوئے کے بس اللہ کے حکم سے جاگے۔ انہی بیریکس میں دو ماہ گزر گئے۔

دوردیس کا پہلا سفر: لاہور ۔ راولپنڈی ۔ پشاور ۔ کوہاٹ

کوہاٹ ۔ بھاپ کے انجن کے ساتھ فرنٹیئر میل

ہماری رہائش کوہاٹ کے کنٹونمنٹ میں تھی جو شہر سے قدرے قریب تھی۔ ہم اور ہمارے قافلہ کی دوسری خواتین سارا دن بنتیں، کاڑھتیں، کھانے پکاتیں اور کھلاتیں، اور سو جاتی تھیں۔ یہی تمام دنوں کا دستور

ہو چلا تھا۔ ایک روز پھر جنون سوار ہوا کہ بڑی بیزاری ہو رہی تھی، لہذا بازار سے کتابیں لائی جائیں۔ کوہاٹ کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی سی تھی۔ خیر جناب تانگہ لیا اور اردلی کو ساتھ لے کر چلے۔ راستے میں تھوڑا سا جنگل اور پھر چھوٹے چھوٹے بازار پڑے۔ بہت خاموشی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ بھی نہ جانے کیوں کچھ مُرجھائے ہوئے سے لگتے تھے۔ بازار میں بھی یہی کیفیت محسوس ہوئی۔ مطلوبہ کتابیں تو مل گئیں لیکن ہر دُکان پر دیکھا کہ دکاندار حضرات نگاہ نیچی رکھ کر بات کرتے تھے، بے حد ادب اور اخلاق کے ساتھ۔ کچھ دنوں بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ وہاں کی عورتیں بھی اُس زمانے کے رامپوری ماحول کے طور وطریق سے رہتی تھیں۔ کبھی باہر نہیں نکلتی تھیں، اور نکلنا بھی پڑتا تو بہت لمبے گھیر دار برقعے میں جسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنا خیمہ ساتھ لے کر چل رہی ہوں۔ صبح کے وقت جب ہم نکلتے تھے تو ہمیں بہت سے لوگ نظر آتے جو سڑک کی طرف پیٹھ کئے اور میدانوں کی طرف منہ کئے نہ جانے کیا دیکھتے رہتے تھے اور کن سوچوں میں غرق رہتے تھے۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ رفع حاجت فرمائی جا رہی تھی۔

بیریکس میں دو ماہ رہنے کے بعد ہم کرائے کے ایک بنگلہ میں آ گئے۔ اس بنگلے میں بڑے بڑے لان تھے۔ ہم تو صرف میاں اور بیوی تھے، اسی طرح دوسرے آفیسر بھی بہت نوجوان سے تھے اور سب کی نئی نئی شادیاں ہوئی ہوئیں تھیں، سوائے ہمارے ایک پڑوسی کیپٹن ضیاالرحمان کے، کہ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ہمارا بنگلہ اس طرح کا تھا کہ اس کی ایک دیوار پڑوسی بنگلہ سے جڑی تھی جس میں یہ کپتان صاحب رہتے تھے۔ ہمارے بنگلے کی دوسری دیوار کی طرف لان اور درخت تھے۔ سامنے سڑک تھی۔ ہم نے اور کپتان صاحب کی بیگم نے مل کر کھانے کا انتظام ایک ساتھ کیا تھا، جس سے ہم دونوں ہی کا کام کم ہو جاتا تھا۔ پھر کیونکہ ہم دراصل خود سے گھر چلانے میں بالکل ہی نئے تھے، لہذا اس انتظام سے ہمیں نسبتاً زیادہ فائدہ ملا۔ دن میں دو مرتبہ ہم ان لوگوں کے خاندان سے کھانے پر ملتے اور پھر خریداری بھی ساتھ ہی کرتے تھے۔

اس نئے گھر میں آئے ہوئے ہمیں ایک ہی دن گزرا تھا کہ دوپہر کو ہمارا اردلی مہندی خان نے باہر سے آ کر اطلاع دی، ''بیگم صاحب ایک صاحب آیا ہے، یعقوب خان نام بتاتا ہے۔ آم اور فروٹ کی پیٹیاں لایا ہے اور بولتا ہے کہ ذِکراللہ خان سے ملنا ہے۔ میں ان کو بول رہا ہوں کہ اب اِدر ذاکر حسین صاحب رہتا ہے، تو وہ نہیں مان رہا ہے''۔ ہم نے کہا کہ ''انہیں کہہ دو کہ شام کو آ جائیں تو صاحب سے ملاقات ہو سکتی

ہے''۔اب یہ حضرت شام کو پھر آ گئے، اور تب ہم نے دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے۔ ہمارے شوہر ابھی نہیں آئے تھے، ہم نے اردلی سے کہہ دیا کہ ان کو بیٹھک میں بٹھا دے اور چائے وغیرہ کا پوچھے۔کافی دیر کے بعد جب ہمارے شوہر واپس آئے تو ہم نے انہیں بتایا کہ یہ صاحب تو ایسے چپک گئے ہیں، نہ ہم ان کو جانتے ہیں نہ یہ ہمیں۔ ہمارے شوہر نے بتایا کہ یہ لوگ بڑے خلوص اور محبت کے ہیں۔ پھر اندر جا کر انہوں نے ان صاحبان سے بات کی، انہیں بتایا کہ ''ذِکر اللہ خان تو اب اِس بنگلے میں نہیں رہتے ہیں، اور ہمیں پتہ بھی نہیں کہ وہ اب کہاں رہتے ہیں''۔ یعقوب خان صاحب نے ہمارے شوہر سے کہا کہ ''کوئی بات نہیں، اب یہ پھل میوہ آپ رکھ لیں، اب آپ بھی ہمارے دوست ہیں''۔ پھر یعقوب خان ہمیں اگلی اتوار کو اپنے گھر بھی بلا گئے۔

ہمارا دِل خوش ہو گیا، اور ساتھ ہی سوچنے لگے کہ نہ جانے یہ کون لوگ تھے۔اس سے پہلے رامپور کے پٹھانوں کے علاوہ اور کہیں ان لوگوں سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔اب ہم فوجی بیریکس سے باہر آئے ہی تھے کہ پہلے ہی دن یہ ایک اور نئی انہونی اُفتاد پڑ گئی۔لیکن ہمارے شوہر جو باہر رہنے کے بہت عادی تھے، زیادہ تشویش میں نہیں آئے اور ہم اس اتوار کو ان خان صاحب کے گھر گئے۔ وہاں تو ایسی خاطر ہوئی بلکہ یوں کہیئے کہ خاطریں ہوئیں کہ ہم بھول نہیں سکتے۔ان صاحب کی بیگم نے ہمیں ایک تولہ سونے کے جڑاؤ والے بندے اور ایک شلوار، قمیض اور دوپٹہ دیا کہ ہم پہلی مرتبہ ان کے گھر گئے تھے اور ان کی بہو کی حیثیت سے وہ ہمیں خالی ہاتھ بھیجنے کو تیار نہیں تھیں۔یعقوب صاحب کے والد کا بندوقوں کا کارخانہ تھا اور یعقوب خان اور اُن کے تینوں بھائی بھی اپنے والد کے اِس کاروبار میں شریک تھے۔ان سب کا کاروبار درّے میں تھا جو اپنی بندوقوں اور اسلحہ سازی کی وجہ سے اب بہت مشہور ہو گیا ہے، اور اس وقت بھی مشہور تھا۔ یہ دوستی جو کچھ آم اور خشک میوہ دینے کے سلسلے سے شروع ہوئی بہت عرصہ قائم رہی۔ جب ہم رامپور واپس بھی آ گئے تو یعقوب خان ہمیں خشک میوہ کی پیٹیاں بھیجتے رہے۔ادھر سے ہم ان کے بچوں کے لئے سوئٹر وغیرہ بھیجتے رہتے تھے۔ پھر یہ یعقوب خان صاحب اپنے ایک دوست جان خان کے ساتھ رامپور بھی آئے۔بعد میں ۱۹۵۲ء میں وہ راولپنڈی میں ہمارے گھر بھی آئے۔ہمیں بھی یہ صاحب اور ان کی بیگمات اس طرح یاد رہیں کہ ۱۹۹۵ء میں جب ہم کراچی میں رہتے تھے تو ہم نے کوہاٹ کے ایک پٹھان کو مالی کی حیثیت سے گھر میں شامل کیا۔اُس سے معلوم ہوا کہ یعقوب صاحب پوتا پوتی والے ہو چکے تھے اور پرانا کاروبار چھوڑ دیا تھا۔ان کے بچوں کو اسکول اور کالجوں کی

تعلیم کے بعد دوسری صنعت میں جانے کا شوق ہوا اور وہ وہاں بھی کامیاب رہے۔

یعقوب خان کے گھرانے نے ہمیں صحیح طرح پٹھانی رواج سے متعارف کرایا۔ البتہ دوسری طرف فوجی گھرانوں سے ہمارا زیادہ میل جول رہتا تھا۔ کچھ ضرورتِ وقت، پھر کچھ فاصلہ کی وجہ بھی تھی کہ اس علاقہ میں نقل وحرکت کے لئے ہمارے پاس کوئی ذرائع نہیں تھے۔ ایک صاحبہ مسز شیدا خان سب کے لئے تفریحات اور ''ہلّے گلّے'' کا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں، بہت زندہ دل اور توانائی سے بھرپور۔ انہوں نے ہمیں فلم ''جوار بھاٹا'' کے بارے میں بتایا اور ہم سے کہا کہ ہم ذاکر صاحب کو منائیں۔ انہوں نے شیدا خان صاحب کو پہلے ہی تیار کرلیا تھا۔ یہاں ایک ہی سنیما ہال تھا اور یہ دلیپ کمار کی پہلی فلم تھی جو ۱۹۴۴ء میں ریلیز ہوئی تھی اور یہاں اب پہنچی تھی۔ اسی لئے بھی مرد راضی ہوگئے کہ دیکھیں کہ یہ کون حضرت آئے ہیں۔ فلم دیکھی، مگر اس وقت کے اور بعد کے دلیپ کمار میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا تھا۔ فلم دیکھ کر سب ہی کی یہ رائے تھی کہ یہ خان نہیں چلے گا چونکہ اس وقت اشوک کمار، جو بہت حَسین سمجھے جاتے تھے، فلمی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ خیر!!

پشاور کا سفر

کوہاٹ میں اسی طرح دن گزر رہے تھے کہ ایک روز مسز شیدا خان نے مژدہ سنایا کہ: ''کل پشاور چلنا ہے''۔ ہم نے بھی راضی ہونے میں زیادہ حیل وحجّت سے کام نہیں لیا۔ ہم دو خاندانوں کے علاوہ ایک مرتضٰی خان صاحب اور ان کی بیگم تھیں۔ پھر جناب دو ٹیکسیاں ہوئیں اور ہم پشاور روانہ ہوئے۔ پشاور بمشکل ۴۰ رمیل دور تھا، لیکن راستہ پہاڑی اور دشوار تھا اور ساتھ ساتھ خوبصورت بھی۔ سڑکیں ایسی کہ کہیں کہیں آنکھیں بند کرلیں ہم لوگوں نے۔ راستے دشوار گزار، پتلی سڑک، کئی جگہوں پر اگر سامنے سے کوئی گاڑی آتی تو ہماری ٹیکسی سڑک کے کنارے ہوکر رُک جاتی تب سامنے سے آنے والی گاڑی کو جانے کا راستہ ملتا۔ سڑکوں کے ساتھ کھائیاں اور وادیاں، اور ان وادیوں میں آبادیاں تھیں۔ مکانوں کی چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور دھویں کے لہراتے ہوئے مرغولے ایک اچھا سماں پیدا کررہے تھے۔ کہیں گھروں میں بکریاں، مرغیاں نظر آئیں، کہیں گھروں سے ملحق باغ، باغیچے اور سبزی ترکاری کے چھوٹے چھوٹے سرسبز قطعے۔ لوگ زیادہ تر اپنی زمینوں پر سبزی ترکاری بونے میں لگے ہوئے نظر آتے تھے۔ عورتیں بھی کھیتوں میں کام کررہی تھیں۔ مرد اپنے گھروں کے باہر بندوقیں بنانے یا صاف کرنے میں مصروف، بچّے بھی ساتھ ہی لگے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ

عورتوں کی ذمّہ داریوں میں نہ صرف کھانا پکانا تھا بلکہ کھانا اُگانا بھی ان کے کاموں میں شامل تھا۔ صاف لگتا تھا کہ تعلیم کا اتنا زور نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے جب چھوٹا اسلحہ بنانے میں لگے ہوں تو اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے ہوکر ان کا اندازِ فکر بھی اِسی کی مناسبت سے ہوتا ہوگا۔

راستے اسی طرح گزرتے رہے اور ہم سب اسی طرح کے تبصرے کر رہے تھے کہ ایک جگہ دونوں ڈرائیوروں نے دونوں ٹیکسیاں روک دیں۔ اب معلوم کیسے کریں کہ یہ کیوں کیا گیا۔ ان کو اردو نہیں آتی تھی اور ہم سب پشتو سے نابلد، کہ ''زبانِ یارِمن پشتو، خومن پشتو نمیدانم''۔ مرتضٰی خان صاحب بولے کہ ''میاں کلمہ پڑھ لو، آج گئے کام سے''۔ عورتیں ساتھ تھیں اور یہ بات مشہور تھی کہ یہاں کے لوگ فوج کے لوگوں کو اغوا کر کے علاقہ غیر میں لے جاتے تھے اور زریانہ کا مطالبہ کرتے تھے۔ اِس جرم کو انگریز بھی ختم نہ کر پائے تھے۔ ہم سب بھی فوج کے تھے گو کہ وردیوں کے بغیر جا رہے تھے اور یہ ہمارا ذاتی سفر تھا جبکہ اغوا کی وارداتیں عموماً فوجی قافلوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ پھر بھی ہمیں تو خوف آنے لگا اور اس میں دوسری دونوں خواتین نے بھی ہمارا برابری سے ساتھ دیا، بالکل بہنوں کی طرح ہم تینوں مل کر خوب ڈرے۔ یہ ڈرائیور ٹیکسیوں سے اُترے اور ٹیکسی سے ایک پوٹلی نکال کر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر بنے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔ کچھ دیر بعد یہ دونوں باہر آئے تو پوٹلی ابھی بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ اب ان دونوں نے اپنی اپنی ٹیکسیاں چلانا شروع کیں۔ مرد حضرات نے ان سے اشاروں کنایوں سے پوچھا کہ معاملہ کیا تھا، تو اندازہ ہوا کہ کچھ کپڑے دینے اور کچھ دوسرے کپڑے لینے گئے تھے، جیسے کہ اس گھر میں کوئی کپڑے سینے والا یا والیاں رہتی ہوں۔ ہماری جان میں جان آئی۔ اس واقعہ کے بعد ہم بغیر کہیں رکے تقریباً شام چار بجے ایک ہوٹل پہنچے۔ چائے وغیرہ پی اور تازہ دم ہوئے۔ اب سورج ڈوبنے لگا تھا لہٰذا سب نے یہ مانا کہ اب کوئی خطرہ مول لینا صحیح نہیں۔ ہم سب ہوٹل کے آس پاس گھوم پھر کر آ گئے۔ ٹیکسیوں کو روکے رکھا تھا اور دونوں ڈرائیور بھی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

دوسرے دن پشاور میں مسجد محبت خان، گورکھتری، قلعہ بلہسار، اور درّہ خیبر دیکھتے ہوئے ہم ان ہی ٹیکسیوں میں دوبارہ اسی راستے سے واپس کوہاٹ روانہ ہوگئے۔ اب پھر وہی ڈر کہ راستے بھی خطرناک اور لوگوں کے بارے میں بھی فوج نے کافی ڈرایا ہوا تھا۔ راستے میں پھر درّہ آدم خیل پر رُکے جو پشاور سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پڑا، حالانکہ یہ پشاور سے صرف ۲۵ / یا ۲۶ / میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہاں ہر گھر میں بندوقیں

بنتی تھیں۔ یعقوب خان صاحب بھی، جن سے کوہاٹ میں ملاقات ہوئی تھی، اِدھر ہی تھے لیکن ہم ان سے ملنے نہیں گئے۔ ہم نے بس سرسری نظر سے اسلحہ دیکھا، لیکن مرد حضرات بڑے غور سے ہر چیز کو پرکھ رہے تھے۔ ہمارے شوہر کو تو بندوقوں اور مشین گن کی نشانہ بازی میں تمغے ملے تھے۔ وہ ان کو دیکھتے اور ان کی اچھائیوں اور خامیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اب ہمیں اس کا دھڑکا بھی لگا تھا کہ ہم فوج کے یونٹ کو بغیر بتائے آئے تھے، جو کہ خطرناک ہوسکتا تھا۔ لہذا جلد ہی ٹیکسیوں میں واپس بیٹھے اور ایک گھنٹے کے بعد کوہاٹ پہنچ گئے، کہ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ یاد رہے کہ اس وقت ہم صرف ۱۶ رسال کے تھے۔

درّہ : ہینڈی سائڈ گیٹ

کوہاٹ سے رامپور واپسی

کوہاٹ میں اسی طرح چند اور ماہ گزر گئے تھے اور زندگی حسبِ معمول کبھی سست اور کبھی تیز رفتار ہوتی رہی۔ پھر یہ ایک دم تیز رفتار ہوگئی، اسطرح کہ ہر صبح ہماری طبیعت خراب ہونے لگی۔ ڈاکٹرنی صاحبہ کو دکھایا تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں اولاد ہونے والی تھی۔ بڑی خوشی ہوئی اور ہر جگہ خط لکھے گئے۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ ہمارے لئے یہی مناسب ہوگا کہ ہم رامپور ہی واپس چلے جائیں۔ لیکن ذاکر صاحب کو چھٹی ملنا مشکل تھی، لہذا اکیلے سفر کا یہ بڑا معرکہ سر کرنے کی ٹھانی۔ ذاکر صاحب نے ہمیں ٹرین کے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر دیا، اور ہم مردانہ ڈبہ میں بیٹھے۔ اس وقت فرسٹ کلاس کے اِس حصے میں صرف دو سواریاں تھیں، ایک ہم اور ایک کوئی انگریز مرد۔ ہم سارے راستے جاگتے رہے اور مختلف کتابیں پڑھتے رہے۔ رات ہوگئی، اور وہ انگریز جو نیچے کی

برتھ پر تھا، ہم سے کہتا رہا کہ ہم روشنی کو بجھا دیں۔ کچھ تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان عجیب سی آوازوں میں وہ کیا بول رہا تھا، اور دوسرے یہ کہ ہم نے مردانے میں اکیلے ہونے کی وجہ سے روشنی تو ساری رات ہی جلائے رکھنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اسی طرح یہ ٹرین پشاور، جہلم، راولپنڈی، اور لاہور ہوتی ہوئی دہلی پہنچی۔ وہاں ہم نے پھر ریل گاڑی بدلی اور رامپور کی راہ لی۔ اس طرح ایک دن کے سفر کے بعد ہم رامپور میں تھے۔ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی، اور سب لوگ خبر سن کر پہلے ہی سے خوش بیٹھے تھے۔ اسی طرح ۱۹۴۶ء شروع ہوگیا اور کچھ دنوں کے بعد ہمارے شوہر کا کوہاٹ میں کام بھی ختم ہوگیا اور وہ بھی رامپور واپس آ گئے۔ اسی اثنا میں ہمارے ہاں ایک خوبصورت لڑکی کی آمد ہوئی جس کا نام ہم نے ریحانہ رکھا، اور پیار سے اسے کنّی کہنے لگے۔

حالاتِ زمانہ نئی صورت اختیار کر چکے تھے، اور پورا ۱۹۴۶ء ہنگاموں کی نظر ہوگیا تھا۔ حکومتِ برطانیہ اپنے بچاؤ کے لئے فوجیں اپنے قبضہ میں کئے بیٹھی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی رسّہ کشی اب ہندو مسلم فساد میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اسی دوران ہماری بیٹی کنی معمولی سی بیمار ہوئیں، اور کچھ ہی ماہ کی عمر میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ کچھ دن ہم نے صدمہ رکھا اور پھر اللہ کے بھروسہ پر صبر کیا۔ ہماری بڑی جٹھانی کی تین لڑکیاں تھیں، سب سے بڑے لڑکے کے بعد۔ انہوں نے ہمارے صدمہ کو دیکھتے ہوئے اپنی تیسری لڑکی تسنیم کو ہمیں دے دیا تاکہ ہمارا غم کم ہوجائے۔ تسنیم ہمارے ساتھ اس طرح رہیں کہ بعد میں ہمارے ہاں تین لڑکے ہوئے اور پھر ایک لڑکی ہوئی۔ اس لڑکی کے پیدا ہونے کے بعد جب ہمارے جیٹھ اور جیٹھانی نے تسنیم کو واپس لیا تو ہمارے اپنے بچوں کو پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ تسنیم اُن کی بہن نہیں تھیں۔

آٹھواں سفر ۔ رامپور اور گنگا کے اُوس پار

اب ۱۹۴۷ء شروع ہوگیا تھا۔ رامپور میں فسادات شیعہ سنّی کے تھے کیونکہ نواب رامپور نے پاکستان کے ساتھ شامل ہونا مناسب نہ سمجھا اور ہندوستان کے ساتھ ضم ہونے کا اعلان کیا۔ اسی دوران اوران ہی حالات میں ہماری نند کے منجھلے بیٹے ذکی محمد کے ایک دوست کی شادی تھی اور لڑکی رہتی تھی قریب کے ایک گاؤں میں ۔ ذکی اس وقت میٹرک کا امتحان دے کر کے بیٹھے تھے اوران کے دوست نے میٹرک کرتے ہی ۱۵ر سال کی عمر میں اپنی شادی رچانا مناسب سمجھا تھا۔ ذکی کو اکیلا جانے دینا مناسب نہ سمجھا گیا اور گھر کا دوسرا کوئی بزرگ اس گاؤں میں جانے کو راضی نہ ہوتا تھا۔ اگر یہ شادی ہماری نند کے بڑے لڑکے کے دوست کی ہوتی تو صورتِ حال ذرا مختلف ہوتی ۔غرض ہم تھوڑے بڑے تھے، ۱۷ر سال کے، لہذا ہمارے خاندان کی نمائندگی کی ذمّہ داری ہمارے اوپر ڈال دی گئی ۔

برسات شروع ہونے والی تھی اور سخت گرمی کے دن تھے۔ اس زمانے میں ہر سفر کے لئے سب لوگ صبح ہی صبح نکلتے تھے۔ کافی فائدے تھے اس کے۔ اس طرح اگر سفر چھوٹا بھی ہوتا تو ناگہانی مشکلات سے نمٹنے کے لئے زیادہ وقت مل جاتا تھا۔ اگر مشکل نہ پڑی تو اپنی منزل پر وقت زیادہ مل جاتا تھا۔ غرض ہم اور ذکی صبح ہی صبح چھ بجے تک لڑکے کے گھر پہنچ گئے ۔ انہوں نے بارات لے جانے کے لئے لاری کا انتظام کیا تھا۔ لاری بھری ہوئی تھی ،لیکن جگہ آرام کی مل گئی ۔ لاری کا سفر کوئی دو تین گھنٹے رہا اور ہم گنگا کے کنارے ایسے دیہہ پر اترے جس کا کوئی نام نہ تھا۔ آپ جو چاہیں پکار لیں ۔ پتہ نہیں اُن کے خطوط کس طرح آتے ہونگے ، یا ہوسکتا

ہے کہ یہ لوگ ڈاک لینے کسی ایسے دیہات کے ڈاکخانہ جاتے ہوں جس کا نام ہو۔ بارات کے استقبال کے لئے دلہن والے بیل گاڑیاں لے کر آئے تھے، خوب دُھلی ہوئی، صاف صاف لگ رہی تھیں۔ رواج ایسا ہی تھا، بیل گاڑیوں کو لوگ کنویں کے رہٹ کے پاس لے جاتے تھے اور پانی ڈال ڈال کر دھو لیتے تھے، لیکن یہ سمجھیں کہ یہ صرف اُس وقت ہوتا تھا جب کوئی اِنتہائی خاص موقعہ ہو۔ ورنہ بیل گاڑی کبھی نہیں دُھلتی تھی، بننے سے جلنے تک، کہ بہت پرانی ٹوٹی پھوٹی بیل گاڑیوں کی لکڑی جلانے کے کام آتی تھی۔ بارشوں سے ہی دھلنے دھلانے کا کام چل جاتا تھا۔

ہم سب اِس باراتی بیل گاڑی میں سوار ہوئے، اور بیل گاڑیوں کا یہ قافلہ چلا۔ اب ہمیں پتہ چلا کہ دلہن کا گھر تو گنگا کہ'' اُوس پار'' تھا، اور اُوس پار جانے کے لئے ایک پل بنا ہوا تھا، بانس اور گھانس سے بنے ہوئے رسّوں کا۔ یہ ایک لٹکا ہوا جُھولا پل تھا جس میں دریا کے کناروں پر بڑے بڑے بانسوں کو گاڑ کر اُن سے رسّے باندھے گئے تھے، اور ان رسّوں سے چوڑے چوڑے تختے لٹکے ہوئے تھے جن کے درمیان سے نیچے دریا نظر آتا تھا۔ ہمارا دل چاہا کہ ہم واپس چلیں، لیکن لاری جا چکی تھی اور یہ دیہہ بس ایسا ہی تھا۔ اب ہم اللہ کا نام لیکر دعائیں پڑھتے ہوئے بیل گاڑی پر سوار ہوئے۔ ہر بیل گاڑی پر صرف دو مرد اور دو عورتیں بیٹھتیں اور ایک وقت میں صرف ایک بیل گاڑی پل پار کرتی۔ کتنی ہی دیر بعد سب باراتی اُوس پار پہنچے اور یہ قافلہ پھر چلا۔ اب کھلا میدان اور کھیت شروع ہوئے۔ ہر طرف گڑھے اور باؤلیاں۔ بیل گاڑی کا ایک پہیہ کبھی ایک گڑھے میں دھم سے نیچے، اور کبھی دوسرا پہیہ نیچے۔ ہم اسی طرح اچھلتے کودتے بیل گاڑی میں سفر کرتے رہے کہ ایک بیل گاڑی کے بیل کا رسّہ ان جھٹکوں سے ٹوٹ گیا اور بیل نے موقعہ مناسب دیکھ کر فرار ہونے کو ترجیح دی۔ اس بیل گاڑی میں بارات کے لیڈر ایک صاحب بنام کالے خاں تشریف فرما تھے لیکن جب بیل بھاگا تو بیل گاڑی کا سامنے کا حصہ فرش انداز ہو گیا، اور ساتھ ہی ساری سواریاں بھی۔ اب بارات روک دی گئی اور سارے باراتی اس بیل کے پیچھے۔ اکثر باراتی کم عمر لڑکے تھے جنہوں نے ذکی اور ان کے دوست دولہا میاں کے ساتھ ابھی میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ غرض دو گھنٹے اس پکڑم پکڑائی میں گزر گئے اور بیل بھی اِس کھیل سے بیزار ہو گیا۔ خود ہی تھک کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا تھا، سو ہاتھ آ گیا۔ سب نے پکڑنے والوں کو خوب شاباشی دی۔ بارات دوبارہ جمع ہوئی اور ہم سب چلے۔ لیکن بیلوں کی رفتار بہت سست ہو گئی تھی۔ مغرب کے وقت دلہن کے گھر پہنچے۔

ہم سب بے حد تھک چکے تھے لیکن دلہن کے گھر میں نکاح، رسومات اور کھانے وغیرہ کے ہنگامہ میں اچھی مصروفیت رہی۔ کچھ کم عمری بھی کام آئی کہ طبیعت پھر نوتازہ ہوگئی۔ سب ہی کم عمر تھے۔ رات دیر گئے کھانے اور رسومات سے فارغ ہوئے تو لڑکیاں گانے بجانے جمع ہوئیں۔ ہمیں بھی کھینچ کر شامل کیا گیا کہ ہم بھی کم عمروں میں تھے۔ ہماری ایک جان پہچان کی لڑکی بھی مل گئیں جو رامپور کے ہوم سیکریٹری آغا صاحب کی بھانجی تھیں۔ یہ بھی گانوں میں شریک رہیں اور اسی طرح صبح ہوگئی۔ ناشتہ آیا تو اس میں بالائی، زردہ، مکھن، پراٹھے اور آم۔ گرمیوں میں درخت پر پکے آم تھے اتنے میٹھے اتنے کہ جام اور جیلی کی طرح۔ ناشتہ کے بعد منصوبہ یہ تھا کہ باراتیوں کو باغات کی سیر کرائی جائے گی اور پھر بارات رُخصت ہو جائیگی۔ باغ میں آموں کے گھنے درخت اور ان پر گہرے زرد اور کچھ گلابی پکے ہوئے آم لدے ہوئے تھے۔ ابھی آدھا باغ دیکھا تھا کہ بارش نے آلیا۔ ایسی طوفانی بارش کہ خدا کی پناہ۔ بھاگم بھاگ گھر کی راہ لی۔ اتنی بارش میں کون گنگا پار کرے۔ اب یہی مشکل، میزبان اصرار کریں کہ رُک جائیں، دو چار دنوں میں بارش رُک ہی جائے گی تب چلے جایئے گا۔ مجبوری کا نام شکریہ، سو بارات وہیں رُک گئی۔ یہ دن بھی کیا بے فکری کے تھے کہ دو چار دن اِدھر اُدھر رُک جانا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا، ورنہ لوگ کیوں رُکتے۔ مزید اتنی ہی مہمان نوازی ہوئی چار دنوں تک، لیکن گھر یاد آنے لگا۔ بارش تھمی تو واپسی پھر بیل گاڑیوں میں بیٹھے۔ اب دلہن بھی ساتھ تھی۔

رامپور پہنچے تو پتہ چلا کہ ہنگاموں میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی، اور پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کا دن ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء قریب تھا۔ لوگوں کے جذبات اور زبانیں، چھریاں اور چاقو، سب مزید تیز ہو گئے تھے۔ جنگ عظیم کے بعد کے بگڑتے ہوئے معاشی حالات اِس جنون کی آگ پر تیل کا کام کر رہے تھے۔